باب ۱۰

میں کیا کروں

فتح النفس

ہر انسان کا فطری سوال ہے ''آخر میں کیا کروں؟'' اس کا جواب خود اس کی اپنی فطرت، اپنے باطن سے آتا ہے۔ بیرونی سطح سے کسی قسم کا تعین نہ کوئی رخ عطا کرسکتا ہے، نہ رہنمائی ، نہ جذبہ عمل کو قیام۔ حیات و قیام اپنی ہی ذات میں ہے اور ان ہی کی بے ساختگی میں اسے عمل پیرا ہونا ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں کی بھی انسان کو اتنی فکر نہیں جتنی کہ میں کیا کروں گی۔ کیا کروں کے ذریعہ ہی وہ کیا ہوں کا نشان پا سکتا ہے اور اپنے کردار ہی سے اپنا جائزہ لے سکتا ہے۔ یہ کروں کہ شدت وہی کن ہے جو ذرّہ ذرّہ میں نمود کی بے تابی ہے۔ اس شدت میں کروں کو نہ حد ہے، نہ تعین ۔ ہے تو بس اتنا ہی کہ ہے، ہو رہا ہے، یا اس ہو رہا ہے سے بھی بے خبری۔ البتہ اس ہوش و حواس کی دنیا میں جسے ہم عالم مادی کہتے ہی، یہ لازم ہے کہ تعینات کے آئینہ میں ہی رونمائی کر کے یہ فیصلہ کریں کہ میں کیا کروں۔ اس فیصلہ کو نہ اپنی فطرت سے کوئی غیرت ہو، نہ زندگی سے، نہ منازل ارتقاء سے، نہ کائنات عالم سے۔ کائنات میں یکتائیت ہے، توازن ہے، میزان توحید ہے۔ خالق و مخلوق میں کوئی دوئی نہیں۔ اسماء و صفات و مجردات میں اپنی اپنی یکتائیت ہے، مگر دوئی نہیں۔ خود اپنے جسم کے مختلف اعضاء میں انفرادیت کے ساتھ یکتائیت توحید ہے۔ یہی حال اپنی ساری ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کا ہے کہ زوجین ہیں، ضدین ہیں، مگر غیریت نہیں۔ بات یک رخی کی ہے۔ ہر شے کا مثبت پہلو دیکھیں اور پائیں۔ انعام و اکرام خداوندی پر نظر ہو نہ کہ اپنی نامرادیوں پر ۔ اس طرح بندے اور مولیٰ کا لگاؤ قائم رہے تو شکرانہ زندگی ادا ہوتا ہے وگرنہ غیریت ہو تو ہزار محرومیاں، ہزار پریشانیاں۔ عام انسان کی زندگی ہو یا خواص کی، حیوانی سطح کی زندگی ہو یا تہذیب یافتہ نفس کی ، ہر بات ہر سطح کی ان ہی انعام و اکرام کی طرف نظر رکھنے سے بنتی ہے۔ یہ یک رخی فطری طور پر ہر بچہ میں ہوتی ہے۔ اسے شفقت پر بھروسہ میں ایک راہ عمل ملتی ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ بڑے ہونے پر جب بھی وہ ربوبیت سے رابطہ منقطع کر لیتا ہے تو محرومی و تاریکی و جمود میں گھر جاتا ہے۔ شمس حقیقت کی موجودگی میں اپنی تاریکیوں اور ظلمتوں سے نکل کر اپنے رحمت کے احسان کو پانا ہوتا ہے ورنہ تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ رحمٰن کے سایوں میں ہر ذی ہوش کو خود اعتمادی نصیب ہوتی ہے۔ اور مراد کو پہنچتا ہے۔ رحمٰن سے نظر ہٹا کر اپنی 'میں' کے فریب میں پھنس

جائے تو انجام کار نامرادی۔ رحمانیت کی تجلی اور شیطنت کی ظلمت ہر انسان کے اپنے اندر ہے۔ رحمٰن کے انعام و اکرام کا شکر گزار ہوتے ہوئے وہ تکالیف میں بھی مطمئن زندگی گزارتا ہے وگرنہ اپنے شیاطین کے زیر اثر وہ نامرادیوں اور شکوہ شکایت میں دن گزارتا ہے۔

ایک سطحی نظر سے انسانی زندگی کو دیکھا جائے تو جسمانی مادی تقاضوں کے حصول میں، اپنی حرص و ہوس کی حد ہے نہ حساب، انجام اس کا بھی محرومی۔ لاکھ انسان اپنی جسمانی، ذہنی، نفسیاتی صلاحیتوں کو خود تربیت دے کر پوری شدت و انہماک اور یک رخی سے کام کرے تب بھی اسے نہ تو تسلی نصیب ہوتی ہے نہ تسکین۔ کامیابی و پر کامیابیاں ہیں۔ کیسی ناکامیاں بلکہ کامیابیاں ہوں تب بھی انسان کے اندر وہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ اور کیا کروں؟ یہ فتح النفس کیسے حاصل ہو۔ نفس کو دبانا، مارنا ، یا فنا کرنا، تو گویا، فطری صلاحیتوں سے بیزاری، روگردانی اور انحراف ہے۔ اپنی بات ہو تو خیر، یہ تو خالق کے مقصد تخلیق تک سے گویا برسرپیکار ہونا ہے، اپنے وجود تک سے مغائرت اور منافرت کا پہلو ہے۔ ہر فرد کے لئے بہر حال اپنا وجود ایک حقیقت ہے مگر دیکھنے میں یہی آیا کہ نفس اور مادی سطح تک ہی اپنی زندگیوں کو محدود کر کے بہت سوں نے لاکھ ہاتھ پیر مارے، بڑے بڑے کارنامے کئے، مگر آج نہ ان کا پتہ ہے نہ ان کے کام کا پتہ، سوائے اس کے کہ ان کے فسانے زیب داستاں ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی حال ان ریاضتوں اور مجاہدوں کا ہوا، جو رحمتوں کی تجلی نا پا سکے۔ تو اس ورطۂ نفس میں گرفتار انسان کا یہ حال کہ جیتے جی بھی عذاب میں، اور مرنے کے بعد بھی عذاب میں۔ یہی حرص و ہوا، حسد، بغض اور نامرادیوں کے سانپ اور بچھو ان کی روح اور لاشعور کے لاشعور تک کے لئے سوہان جان بن گئے۔ بار بار اور لاکھ بار انہوں نے تسکین و تسلی کی تلاش میں ان ہی کی کیفیات میں سے پھر سے گذر کر دیکھا مگر اپنی آگ میں جلتے رہے۔ اس گرداب فنا میں وہی عمل باعث تسکین فطرت نظر آئے جو دوسروں کے لئے فی سبیل اللہ کئے۔ یہی اعمال اپنے انجام کو پہنچے۔ اپنے نفس کی خاطر جو کچھ بھی کیا اس کی ناتمام تمنائیں عذاب دائمی بن کر رہ گئیں۔

رب کی رحمت کی تلاش

اس گرداب سے وہی نکلے جنہیں رحمت کی تجلی ملی۔ انہوں نے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کا صحیح مصداق ہو کر یہ کہا ہے اے ربّ ہم نے اپنی فطری صلاحیتوں کا شکرانہ ادا نہ کر کے اور انہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے بروئے کار نہ لا کر ان صلاحیتوں کا ساتھ بھی ناانصافی کی اور اپنے ساتھ بھی۔ ان فطری صلاحیتوں کے مزاج و خمیر میں جو پھیلنے اور بلند ہونے کی رحمت تھی، اس کی طرف توجہ

نہ دی۔اب تو صحیح توبہ کے معنی یہی ہیں کہ اس کے ذریعے نئے دروازے کھلیں۔شکرانہ کے طور پر نئے عزم، نئے حوصلے کے تحت زندگی، اپنے مقرر کردہ اعلیٰ نصب العین کی طرف قدم رکھے۔ یہ رحمتوں کی شناسائی اپنے ہی اندر پانی ہے۔ یہ کن کا پھیلاؤ جوشِ نمود ہے۔اپنے حسن باطن کی خود آگہی کی پہلی جھلک ہے۔ دوسرے معنوں میں پہلی بسم اللہ ہے۔ ساتھ نام اللہ کے۔تمام اسماء وصفات، خوبیوں اور صلاحیتوں پر بھروسہ ہے اور رحمت کو پہچانتے ہوئے هُوَ مَعَكُمْ کا شکرانہ۔اب اس محرک کیفیت میں زندگی گزارنی ہے کہ ساری کی ساری کائنات اسی ربّ العالمین کے دامن رحمت میں پل رہی ہے، پروان چڑھ رہی ہے۔ جیسے ہی انسان اس شکرانہ بندگی کی ادا کو پانے لگتا ہے، اس کے سب کام ایک ہی رخ اختیار کرنے لگتے ہیں۔میرا ربّ وہ جس کا مجھ سے بلا واسطہ تعلق ہے، اس تعلق کا مضبوط ہونا تو خیر عاشقوں کے نصیب میں ہے ،مگر عام انسان کم از کم اتنا تو کرے کہ اپنی انانیت اور خودمختاری یا وہموں، وسوسوں، ظلمتوں سے نکل کر اپنے ربّ کی رحمت کو ہی اپنے اندر اور باہر کارفرما پائے۔ظاہر ہے کہ اس کا ربّ وہی جتنا اس کو شعور اور اس کے شکر کا احساس ہے مگر جوں جوں اس کا شعور منزل بہ منزل لاشعور اور لاشعور کے لاشعور تک ہم آہنگ ہوتا چلا جائے، وہ اپنے ربّ کے ساتھ استحکام پکڑتا چلا جائے گا۔اور اگر بے لگام ہو کر زندگی گزارنا چاہے تو شاید اسے اپنی صلاحیتوں اور قدرتوں کے انعامات کا پتہ ہوتے ہوئے انہیں بروئے کار لانے کی تڑپ آجائے مگر اپنی سطحی زندگی کی بناء پر اسے اپنے ربّ کا احسان ماننے کی نہ طلب ہوگی، نہ فرصت۔نتیجتاً وہ ایسے کاموں میں لگا رہے گا جن کا انجام ناتمامی، نامرادی، یا جھوٹی جھلک ہے۔ارشاد باری ہے کہ سوائے وَجْهُ رَبّ کے سب کو فنا ہے تو وہ چیز جس کی قدرت و قیمت دائمی ہے ربّ ہے اپنے اندر اس رب کی آئینہ داری جن اقدار کے ذریعہ ہوتی ہے، ان ہی کی قدر و قیمت دائمی ہے۔اور یہ سوائے اعلیٰ اقدار کے کیا ہو سکتی ہے۔ خلوص، عمل، انہماک کار، جمعیت بندی، خدمت، محبت، صداقت، شہادت، ولایت، رحمت ، وغیرہ ہی وَجْهُ رَبّ کی رونمائی کرتی ہیں۔انہی کو اپنی مشعل راہ بنا کر جواب پالے کہ میں کیا کروں! ان تمام اقدار کا تعلق جمعیت سے ہے، عالم انسانی سے یہ ہے۔اپنے نفس اور لطیفہ نفس کی سطح۔اب مقام قلب میں آنے کی بات لگاؤ اور محبت کی یک رخی سے لے کر عشق کی وارفتگی اور بے ساختگی پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں اس سوال کا جواب اور بھی آسان ہو جاتا ہے کہ میں کیا کروں۔ بلکہ اس سوال کے پوچھنے کی یوں ضرورت ہی نہیں رہتی کہ خود بخود اس کی باطنی فطرت، محبوبؐ کی تڑپ میں یک رخی قائم رکھتی ہے۔بات بس عشق کے جاگنے کی ہے۔ عاشق کے لئے سب کچھ اُس کا محبوب، سب کچھ اس کے محبوب کے لئے، سب کچھ اس کے محبوب کے نام پر۔اس لئے اس لئے اس کا محبوب ہی اس کا رب ہے اور وہی حقیقی معنوں میں اس کی روح کی پرورش کرتا ہے۔لہٰذا عاشق کو یہ بتانا کہ کیا کرے فضول ہے۔اس کے لئے تعین راہ موجود ہے۔ ''الا'' اعلیٰ مقامات کے کہ وہاں اٹھا ہی لیا جاتا

ہے۔رحمتوں کے سایوں میں پروان چڑھتا ہے۔خودامر الٰہی کے اجراء کا ذریعہ بنتا ہے۔

کیا کروں کا مسئلہ تو ان ہی کے لئے کٹھن ہے جن کی منازل مقام نفس تک ہی محدود ہیں۔ان کے لئے تعین راہ کے ذرائع مذہب و ہدایت ہیں یا فیض صحبت۔ان کا اصل حاصل یہ ہے کہ انسان کے ان ہی اعمال میں صداقت وخلوص اور دوام ہے جو دوسروں کی خاطر ہوں، جمعیت اور عالم انسانی کی خاطر ہوں۔ان کے لئے گھر، ماحول، مذہب، معاشرہ مملکت ہی اجتماعی نظریہ کوفروغ دے سکتا ہے۔وگرنہ فردتو لاکھ پڑھ جائے یا ہنرمند وعقلمند ہو جائے اپنے اعلیٰ اقدار اور جمعیت کی فلاح کی طرف خودبخود بہت کم رجوع ہوسکتا ہے۔چونکہ جمعیت کی زندگی ہی میں فروغ افراد ہے،اس لئے اب یہ سوال کہ میں کیا کروں ایک زیادہ مستحکم صورت اختیارکر لیتا ہے کہ ہم کیا کریں۔ربّ کے احسانات وانعامات کا شکرانہ اب وہ جمعیت کی خاطر خلوص عمل سے ادا کرسکتا ہے۔جمعیت کے لئے جو کام کیا جائے اسے دوام بھی ہے۔اور بقاء بھی۔

شکر

ہر فرد کے لئے ایک سادہ نفسیاتی نسخہ جو اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے یہ ہے کہ'' جوشکر کرتے ہیں ہم انہیں زیادہ دیتے ہیں'' ایک حدیث مبارک بھی ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدھا گھڑا پانی آیا جوشکرگزار بندہ ہے وہ کہتا ہے آدھا بھرا ہوا ہے اور جن میں شکایت کا جذبہ ہے وہ کہتے ہیں آدھا خالی ہے۔اللہ نے اپنے ان انعام واکرام پر جو اس نے انسان کے وجود میں خود عطا کئے ہیں اور جو ماحول اس کے لئے میسر کیا ہے بار بار توجہ دلوائی ہے۔اگر ان انعامات کی گنتی کرائی جائے یا بیان کی جائے تو سمندروں کے پانی کو روشنائی بنا کران انعامات واکرام کو بیان کیا جائے تو بھی نہ لکھے جاسکیں۔اپنے جسم کو ہی لیجئے جب ذرا سا داڑھ میں درد یا گھٹنے پر ذرا سی چوٹ ہی لگ جائے تو ہم تڑپ اٹھتے ہیں،مگر یہ کبھی خیال نہیں گزرتا کہ جو ساری عمر بغیر درد یا چوٹ کے گزار دی اس کے پس پشت کتنا بڑا نظام انسان کے باطن میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔اس کی آگہی ہم کو یوں نہیں ہوتی کہ اس نظام میں ہم سے کوئی بیگانگی ہی نہیں ہے۔مگر یہ بھی کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم کو چونکانے کے لئے کبھی گھٹنے پر چوٹ لگا دی، کبھی کسی اورطرح ہمیں خود ہی اپنی طرف متوجہ کیا۔ بہ مصداق بالا حدیث، اگر تمھاری ایک آنکھ پھوٹ گئی اورتم بجائے اس کے صدمے میں رونے کے اور ناشکری کوجگہ دینے کے جو آنکھ بچ گئی ہے اس کے سچے دل سے شکرگزار ہو،تو قسم ہے اس ذات پاک کی، کہ نہ ہی صرف وہ تمھاری پھوٹی آنکھ واپس آجائے گی بلکہ تمھاری بصیرت کی آنکھ بھی روشن ہو جائے گی۔ (یہ تجربہ کی بات کہہ رہا ہوں) یہ تو ہوا ٹھوکر کھانے کے بعد ہوش میں آنا۔ جب بھی ہوش میں آجائے اپنے آپ کو خوش نصیب

سمجھے۔ (کہ اس رحیم کریم کا رُخ تمھاری طرف ہے اور وہ تمھیں نظر انداز نہیں کر رہا، نہ ہی سزا دے رہا ہے) مگر حقیقتاً انسان کا مقام یہ نہیں ہے یہ تو ایک جانور بھی ڈنڈے پڑیں تو سیدھا ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی سیدھا نہ ہوا تو حقیقتاً "اَسْفَلَ السَّافِلِیْن" سے ہے۔ جو قہر کے روپ میں احسان کو نہ دیکھے اور انعام کی بشارت نہ پائے۔ اس پر بس اللہ رحم کرے۔ ہاں تو انسان کا کم از کم مقام وہ ہے جو عام زندگی میں کسی خاص تکلیف میں یا ابتلاء میں نہ ہو۔ جیسے غالباً نوے فی صد انسان ہیں جن کے روزمرہ کے مشاغل میں زندگی اچھی خاصی گزر ہی جاتی ہے۔ ان کے لئے راستہ بہت سہل ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے انعامات پر جو تمھارے اندر اور باہر ہیں ان پر ایک لمحہ کے لئے غور کریں۔ یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ایک منٹ کے لئے اپنے ہاتھ سے اپنے نتھنوں کو بند کرے اور سانس روک لے، جب دم گھٹنے لگے اور بے چینی شدت پکڑے تو ہاتھ چھوڑ دے اور پھر جو گہری سانس لے تو یہ سانس خود بخود بغیر الفاظ کے پکارتی ہے "شکر اَلْحَمْدُ للہ، شکر الحمد اللہ" تو ذرا غور کرو، تم جو بغیر احساس کے سانس لئے جا رہے ہو اور اللہ تعالیٰ نے جو پاک ہوا تمھیں دی ہے اس کا کس زبان سے شکریہ ادا کر سکتے ہوں۔ کر کے دیکھو۔ اور بار بار کر کے دیکھو یہ کوئی چلہ کاٹنا نہیں ہے۔ بہت معمولی بات ہے۔ اور جب یہ بات دل میں جم گئی تو پھر شکر گزار ہونے کے معنی تمھاری سمجھ میں آئیں گے۔ اور دل پر نقش ہوں گے۔ اس کے بعد جیسے نئی نورانی دنیا تمھارے لئے کھل جائے گا۔

کچھ طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں، خصوصاً نسوانی طبقہ میں، جو طبعاً ہمیشہ کمی کی طرف نظر رکھتی ہیں، اور شکوہ شکایت ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک دلچسپ نقل بے جا نہ ہوگی جو غوث علی شاہ قلندرؒ نے ارشاد فرمائی ہے۔ ایک بزرگ تھے اور ان کی ایک محترمہ بیوی بھی تھیں۔ بیوی نے کہیں سن رکھا تھا کہ بزرگ ہوا میں اڑ کر کہیں جاتے ہیں تو اس نے اپنے شوہر سے شکائت کی کہ تم بھی بزرگ ہو ہمیں کبھی اڑ کے نہیں دکھایا انہوں نے کہا آج رات کو کوٹھے پر سو جانا اور دیکھ لینا۔ چاندنی رات تھی اور یہ اسمان کی طرف دیکھتی رہی دیکھا کہ ایک شخص ہوا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ صبح میاں نے پوچھا کیوں بی بی دیکھ لیا نا۔ بیوی نے جواب دیا اچھا وہ تم تھے، میں جب ہی سمجھ گئی تھی۔ میاں نے پوچھا وہ کیسے؟ تو بیوی نے جواب دیا، ٹیڑھے جواڑ رہے تھی۔ کہتے ہیں فقیر اور عاقل میں یہی فرق ہے۔ فقیر مطلوب کی ہر شے میں حسن و خوبی دیکھتا ہے جو واقعی وہاں موجود ہوتی ہے اور سچ کہتا ہے۔ عاقل ہر شے میں اپنے معیار پر مبنی کوئی کمی یا کسر دیکھتا ہے اس سے متنبہ کرتا ہے اور وہ بھی سچ کہتا ہے۔ تو بالاحدیث کے معیار سے ناپا جائے تو فقیر ان بندوں میں آتا ہے جو شکر گزار بندے ہیں اور عاقل وہ جو گھڑے کو آدھا خالی دیکھتا ہے۔ دونوں ہی سچ کہتے ہیں مگر کتنا فرق ہے!

ہماری ابتلاؤں کو اپنے اعمال کی سزاؤں پر مضمر کرنا یا اپنے ان اعمال پر جن کو ہم نیک سمجھتے ہیں، جزا کی امید لگائے

بیٹھنا، ایک نادانی کا پرتو ہے۔ اگر ہم جزا وسزا کے چکر میں پڑے رہے تو بہت گھاٹے میں رہیں گے، چاہے جہاں تک ہمارا شعور کام کرتا ہے، یا پیدائش سے موت تک ہم کلام الٰہی یا سنت نبویؐ سے ایک بال برابر بھی علیحدہ نہ ہوئے ہوں۔ ہاں تو وہ کون سا راستہ ہے کہ جو بے خوف وخطر ذمہ دار بنے گا، گارنٹی لے گا کہ

"لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"o

یہ صرف رحمتوں کوانوار کی دنیا میں پانا ہے۔ "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ" اوراس نورانی دنیا میں قدم رکھنے کا سب سے سہل اورلذت آفریں راستہ ہے، شکر گذار بندہ بننا۔ بظاہر یہ کٹھن سی بات معلوم ہوتی ہے کہ میری ایک آنکھ پھوٹ جائے یا میرے بڑھاپے کا اکلوتا فرزند اللہ تعالیٰ اٹھالے تو بھی میں شکر گزار ہوں۔مگر اے بد بخت تیری دوسری آنکھ تو باقی ہے اورکیا کیا کچھ نہیں ہے۔اس کا شکر کیوں نہیں ادا کرتا اورتو اپنے بڑھاپے کا سہارا اپنے لڑکے کو گردانتا ہے۔توبہ کرتوبہ! نہ وہ رزاق ہے، نہ وہ ربّ ہے۔سہاروں کو چھوڑ اور جو دی ہوئی نعمتیں ہیں ان پر غور کر اورشکر گزار بندہ بن اورتو دیکھے گا کہ واقعی یہ جذبہ بصیرت جب تیرے دل میں اتر جائے تو یک لخت تو ایسی روشنی میں آئے گا کہ انبساط سے تیرا جگر شق ہو جائے گا اور شکرانہ میں دل یہی پکار پکار کے کہے گا کہ سر کو سجدہ شکر میں جھکا اور پھر عمر بھر نہ اٹھا۔کر کے دیکھو، نہ عقیدے کی ضرورت ہے نہ ایمان کی۔چاہے تم کسی مذہب یا کسی فرقے سے بھی ہو۔ایک دفعہ کر کے تو دیکھو۔ہاں البتہ جب کسی آگ میں جل رہے ہو یا دردقولنج اٹھ رہا ہو اس وقت ایسا خیال بھی کیوں آئے۔ایسے وقت میں جوقولنج اٹھا ہوا دوا کا کیسے خیال آجاتا ہے۔صحت کی طرف کیسے خیال جاتا ہے۔یہ مثبت پہلو کہاں سے ابھرتا ہے۔یہ رحمت کی ٹپ ٹپ تمھارے اندر ہی موجود ہے۔وہ خود بے تاب ہے۔کیسا شکر کا مقام ہے۔ذرا سا شکر کوموقع دو پھر دیکھو رحمت کھلتے کھلتے کس قدر شاندار شجر کی صورت اختیار کرتی ہے جس کی جڑیں نفس ہی میں مستحکم رہتی ہیں اورخدا جانے وہ درخت کہاں تک اوپر پہنچتا ہے!

اکثر لوگ جو روحانیت کی طرف مائل ہیں اور مالک کے کرم سے وہ کامیاب بھی رہے ہیں اور فتح بھی پائی ہے ان کی ابتداء عموماً کسی ایسی گہری ٹھوکر یا سانحہ سے ہوئی ہے جو قلب کی گہرائی تک کو ہلا گیا ہے۔مگر ان لوگوں کے عروج کی کوئی انتہا نہیں ہے جن میں شکر گزار ہونے کا جذبہ طبعًا موجود تھا۔اوراسی کی ربوبیت پر وہ پروان چڑھتے رہے۔

"اَلَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَاسْتَقَامُوْا عَلَيْهِ"۔

ان لوگوں نے اللہ کو رب کہا اور اس پر قائم ہو گئے۔ جب رب کو دیکھیں تو مزہ ہے۔ پھر ظلمتیں ستاتی نہیں۔اکثر

طریقت کے راستوں میں نہ صرف یہ کہ اپنے نفس سے جہاد بلکہ سینکڑوں ظلماتی صورتوں سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان ہی مجاہدوں میں الجھ کر زندگیاں صرف کر جاتے ہیں اور نورانی انبساط کی دنیا کی آرزو تو باقی رہ جاتی ہے۔ مگر اس زندگی میں اللہ ہی رحمت فرمائے تو یہ میسر آئے وگرنہ بعد کا حال تو وہی جانے۔ مگر یہ عجب کرشمہ اور عجوبہ ہے کہ وہ جو صرف زبان سے نہیں بلکہ روئیں روئیں سے شکر میں زندگی گزارتے ہیں، ان کو واقعی نہ کبھی داڑھ کا درد ہوتا ہے نہ گھٹنے پر ٹھوکر لگتی ہے۔ یہ تو عجب معجزہ ہے۔ کہ باطن و ظاہر کائنات کا ہر ذرہ اپنا دوست رکھتا ہے اور دوست کی خاطر سب کچھ نثار کرنے کے لئے بے چین معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ کائنات کا ذرہ ذرہ نہیں بلکہ یہ وہی **رَحْمَتٌ لِلعالمینی** کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ اگر رحمت کے معنی سمجھنے ہوں تو کچھ دن کے لئے ہی سہی، ایکٹنگ کر کے ہی سہی۔ شکر گزار بندے بننے کی کوشش کرو تو جیسے بچوں کی ایکٹنگ پر ماں، باپ مسکرا دیتے ہیں، اسی طرح تمھاری اس ایکٹنگ پر رحمت کھل کھلا کر ہنس پڑے گی اور تمھیں اپنی گودی میں لے لے گی۔

❁❁❁❁